

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وقت کا اہم ترین سوال

اسلامی نظام حکومت

کس قسم کا ہوگا؟

اسلامی نظام حکومت

پہلے اس سوال کا چرچا عام ہو رہا ہے کہ اسلامی مملکت کے نظام حکومت کاؤہا کچھ کس قسم کا ہوگا۔ اس سلسلہ میں حکومت کی طرف سے کوئی سوالنامہ بھی جاری ہوا ہے۔ ہمیں وہ سوالنامہ تو موصول نہیں ہوا لیکن قرآنی فکر سے دلچسپی رکھنے والے احباب کی طرف سے یہیں گہرا جا رہا ہے کہ یہ ضروری ہے کہ قرآن مجید کی روشنی میں اس ڈھانچے کے خط وخال نمایاں کئے جائیں۔ یہ سطور انہی نقاضوں کی تجل میں سپرد قلم کی جا رہی ہیں۔

قرآن کریم کی روش سے اسلامی مملکت قرآنی قوانین کی حکمرانی کا نام ہے۔ اس لئے اس باب میں پہلا اور بنیادی سوال قانون سازی کا ہوگا۔ ہم پہلے اسی سوال کو دیکھتے ہیں۔ بعد میں بتایا جائیگا کہ ان قوانین کے وضع اور نافذ کرنے کی مشینری کس قسم کی ہوگی۔ اسی کو اسلامی حکومت کہا جائے گا۔

(۱)

انسان فطرتاً ہی الطبع واقع ہوا ہے جس کی وجہ سے اس کے لئے بل جل کر رہنا ضروری ہے۔ انفرادی زندگی میں (یعنی جہاں ایک فرد تنہا زندگی بسر کرے) کوئی تصفیہ طلب معاملہ پیدا نہیں ہوتا لیکن اجتماعی زندگی میں اس قسم کے معاملات کا نمودار ہونا ناگزیر ہے۔ جب دو انسانوں میں کوئی نزاع پیدا ہو جاتے تو اس کے لئے کسی ثالث کی ضرورت ہوتی ہے جو ان کے متنازع فیہ معاملہ میں تصفیہ کرے۔ جو صورت دو افراد میں پیدا ہو سکتی ہے وہ عام معاشرہ میں بھی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے لئے بھی کسی ثالث کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس ضرورت کے پورا کرنے کے لئے انسانوں نے اپنے لئے ایک نظام وضع کیا جسے نظام حکومت کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس کی ابتدائی شکل تو قبائلی یا پانچایت کی سی تھی لیکن اس کے بعد جب اس نے وسعت اختیار کر لی تو کسی ثالث کی ثالث کی ضرورت پیش آتی۔ اس ثالث کو حاکم کہہ کر پکارا گیا۔ یعنی فیصلہ کرنے والا۔ اسے شخصی حکومت کہتے ہیں۔ یعنی وہ حکومت جس میں ایک فرد کا حکم قول فیصل قرار پایا جاتا تھا اور اس کی نافرمانی مستوجب سزا ہوتی تھی۔ بالفاظ دیگر اس میں جملہ افراد معاشرہ اپنے ہی جیسے ایک انسان کے محکوم ہوتے تھے۔ انسانی تمدنی زندگی آگے بڑھی تو احکام کی جگہ قانون کا تصور پیدا ہوا۔ احکام اور قانون میں فرق یہ تھا کہ حکم تو وقتی ہوتا تھا لیکن قانون سے مراد یہ تھی کہ جب تک اسے بدلنا نہ جائے وہ کارفرما ہے اس وقت سوال یہ پیدا ہوا کہ اس قسم کے قوانین کون وضع کرے۔ قانون کی حکمرانی کے زمانہ میں یہ جو ہم نظام حکومت کی مختلف شکلیں دیکھتے ہیں تو یہ درحقیقت انسان کی اسی کوشش کے مختلف مظاہروں کا نام ہے جس کی رو سے وہ طے کرتا تھا کہ قانون سازی کے اختیارات کسے حاصل ہونے چاہئیں۔ اس کی آخری شکل نظام جمہوریت ہے۔ لیکن عہد گہن کی شخصی حکومت ہو یا عصر حاضر کی جمہوریت، اس میں انسان بہر حال اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کے فیصلوں کا محکوم رہتا ہے۔

۲۔ انسان کی ان تمام کوششوں کے برعکس اللہ تعالیٰ نے ایک دین عطا فرمایا جس کی بنیاد احترام انسانیت اور شرفِ انیت پر تھی۔ اس نے کہا کہ ہر انسان انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب الکریم ہے۔

اس لئے یہ چیز شرفِ انسانیت کے منافی ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم ہو۔

وہ ایک انسان ہو یا انسانوں کا کوئی گروہ، وہ کسی کا حکم ہو یا انسانوں کا وضع کردہ قانون۔ بات ایک ہی ہے۔ اس میں انسان دوسرے انسانوں کا محکوم ہوتا ہے اور یہ چیز احترامِ آدمیت کے منافی ہے۔ اس لئے یہ انقلاب آفرین عمل کیا کہ

مَا كَانَ لِیَسْخَرُواْ مِنْ بَشَرٍ اَوْ یُؤْتِیْهِ اللّٰهُ الْکِتٰبَ وَالْحُکْمَ وَالنَّبُوَّةَ ثُمَّ یَقُوْلُ لِلنَّاسِ

كُونُوا عِبَادًا لِّمَنْ دُونِ اللّٰهِ (۱۱۰)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں۔ خواہ اسے غلط قوانین، اختیار حکمرانی، حتیٰ کہ نبوت بھی کیوں حاصل ہو کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں بلکہ میرے محکوم بن جاؤ۔

اس آیت میں کہا گیا ہے کہ حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے، کسی انسان کو نہیں، خواہ وہ شخصی حکومت کی شکل میں ہو اور خواہ قانون سازی کے اداروں کی صورت میں۔ حتیٰ کہ نبی تک کو بھی اس کا حق حاصل نہیں۔ شرف انسانیت کا تحفظ اسی صورت میں ممکن ہے کہ حکم دینے یا قانون صادر کرنے کا حق انسانوں سے بالاکسی ہستی کو ہو۔ اس ہستی کو اللہ کہا جاتا ہے۔ جو لوگ اس حقیقت کو تسلیم کر لیں انہیں مومن — یعنی خدا پر ایمان لانے والے کہہ کر پکارا جائے گا۔ بالفاظ دیگر ایمان باللہ کا بنیادی مفہوم یہ ہے کہ حق حکومت کسی انسان کو حاصل نہیں صرف خدا کو حاصل ہے۔

اس ایمان باللہ کے بعد لایا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ ہمیں کہیں دکھائی دیتا ہے نہ وہ ہمارے سامنے

آتا ہے۔ نہ ہم اپنے کالوں سے اس کی بات سن سکتے ہیں تو اس کے احکام کی اطاعت کس طرح کی جائے؟ اس کا جواب خدا نے اسی آیت ... میں دے دیا جس کا آدھا حصہ ہم نے اوپر درج کیا ہے۔ اس کا باقی حصہ یوں ہے :-

وَلَئِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاَتَّبِعْ مَا كَتَبَ وَحَمَلَ كُنْتُمْ تُدْرِكُونَ (۱۱۱)

نہیں کسی انسان کی حکومت اختیار نہیں کرنی چاہیے۔ حکومت صرف خدا کی اختیار کرنی چاہیے اور اس کا ذریعہ وہ کتاب ہے جسے اس نے نازل کیا ہے۔ جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو اور جس کے احکام و مطالب تم اپنے دل و دماغ میں جاگزیں کرتے ہو۔

آپ غور کیجیے کہ قرآن کریم نے کیسے بلیغ انداز سے اس بات کو سمجھا دیا کہ خدا کی حکومت اختیار کرنے کا قابل عمل طریقہ کیا ہے۔ آپ غور کیجیے کہ آج اس دور میں جسے انتہائی تہذیب و تمدن کا زنا نہ کہا جاتا ہے، مبنی بر عدل حکومت کا تصور یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے ایک آئین مرتب کرتی ہے۔ اس آئین کو کتاب کی شکل میں شائع کیا جاتا ہے۔ پھر اس آئین کے مطابق قوانین وضع کئے جاتے ہیں اور وہ قوانین بھی کتابوں کی شکل میں عام کئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہر متنازعہ فیہ معاملہ کے تصفیہ کے لئے ان کتابوں کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر حکمرانی کتاب کی ہوتی ہے۔ کتاب کی حکمرانی میں کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ وہ لوگ کہاں ہیں جنہوں نے اس کتاب کو مرتب کیا تھا۔ وہ ہمارے سامنے کیوں نہیں آتے۔ ہم ان کی کوئی بات نہیں مانیں گے جب تک وہ ہمیں خود حکم نہ دیں، کوئی اس کا اتفاقا نہیں کرتا۔ غور کیجئے کہ قرآن کریم نے یہ بات چودہ سو سال پہلے کہی تھی کہ حکمرانی کتاب (وہاں قوانین) کی ہوتی ہے اور اس کی موجودگی میں اس کی ضرورت نہیں رہتی کہ صاحب کتاب خود ہمارے سامنے آ کر حکم دے تو پھر ہی اس کی اطاعت کی جائے۔ کتاب کی اطاعت درحقیقت کتاب دینے والے کی اطاعت ہوتی ہے۔ لہذا اللہ کی اطاعت کی عملی شکل اس کی کتاب کی اطاعت ہے اور اللہ پر ایمان کا عملی مفہوم اس کی کتاب پر ایمان لانا ہے۔ جو شخص خدا کی کتاب پر ایمان نہیں لانا، اس کا خدا پر ایمان لانا بھی قابل تسلیم نہیں ہو سکتا۔ اور جو شخص اس کی کتاب کی حکومت اختیار نہیں کرتا وہ خدا کی حاکمیت سے انکار کرتا ہے۔ یہ وجہ ہے جو اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ :

وَمَنْ لَّمْ يَخُفْهُمُ يَمَّا آتَاكَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ۔ (۱۱۰)

جو لوگ خدا کی کتاب کی محکومیت اختیار نہیں کرتے وہ تو من نہیں کا فر کہلاتے ہیں۔

۱۲) جس کتاب کی محکومیت اختیار کی جانی مقصود ہو، یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ اپنی ہر بات کو واضح طور پر بیان کرے۔ اس میں کوئی ابہام نہ ہو۔ کسی قسم کا التباس نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی اس خصوصیت کو مختلف مقامات پر واضح کر دیا۔ مثلاً سورۃ النحل میں ہے:-

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ..... (۱۱۱)

اے رسول! ہم نے تم پر ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جو اپنی ہر بات کو نہایت وضاحت سے بیان کر دیتی ہے۔

۱۳) خدا کی اس محکومیت کا سلسلہ تو شروع سے جاری تھا لیکن چونکہ اُن (ابتدائی) ادوار میں نہ انسانی ذہنوں میں بہت کم سنجائی آئی تھی نہ ان کے علم اور تجربہ میں وسعت پیدا ہوتی تھی نہ اس لئے انہیں زیادہ تر وقتی اور عارضی احکام دیئے جاتے تھے۔ یہ وجہ تھی کہ ان کی طرف جلد ہی جلدی رسول بھیجے جاتے تھے اور ان رسولوں کا دائرہ کار بھی محدود ہوتا تھا۔ جب مشیت کے پروگرام کے تحت انسانیت سنجائی کے دور میں پہنچ گئی (یوں کہتے کہ جب سچے جوان ہو گیا) تو خدا کی طرف سے ایک ایسا ضابطہ آئین و قوانین نازل کروایا جو عالمگیر انسانیت کے لئے بھی کافی ہو اور آئے دئے تمام زمانوں کے تقاضوں کو بھی محیط ہو۔ وہ ہر طرح سے مکمل ہوا اور اس میں کسی تغیر و تبدل کی ضرورت نہ پڑے جتنا نچا اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو نازل کر دینے کے بعد فرمایا کہ:-

وَقَدْ مَتَّ كَلِمَةً رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدًّا۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِمْ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ..... (۱۱۲)

تیرے رب نے جو کچھ انسانوں سے کہنا تھا، اسے اس کتاب میں مکمل کر دیا گیا ہے۔ نیز اس میں مندرج قوانین میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ یہ ضابطہ قوانین اس خدا کی طرف سے نازل کر دیا ہے جو سب کچھ منتا سب کچھ جانتا ہے۔

یعنی اس ضابطہ قوانین میں نہ کسی اہمیت کی ضرورت ہوگی اور نہ ہی کسی قسم کے تغیر و تبدل کی۔ اس کے بعد ایک ہی سوال باقی رہ جاتا تھا کہ اگر کسی وقت یہ کتاب حوادثِ ارضی و سماوی سے ناپید ہو گئی، یا اس میں کسی نے تحریف کر دی، تو پھر کیا صورت ہوگی۔ فرمایا کہ اس کا امکان ہی نہیں، اس لئے کہ:-

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ۔ (۱۱۳)

ہم نے ہی اس کتاب کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمے دار ہیں۔ اس میں نہ تحریف ہو سکے گی اور نہ ہی یہ ضائع ہوگی۔

یعنی قرآن مجید خدا کا مکمل ضابطہ قوانین ہے جس میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کی ضرورت پیش نہیں آئے گی اور یہ غیر محرف بھی رہے گا اور محفوظ بھی۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی کتاب کے بعد خدا کی طرف سے کسی رسول کے آئے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ختمِ نبوت اس کا لازمی اور قطعی نتیجہ تھا۔

(۱۴) ہم نے دیکھا ہے کہ دین، مذہب کی طرح خدا اور بندے کے درمیان کسی پراسٹیوٹ حقیقے کا نام نہیں جو انسانوں

کے خود ساختہ تصور کی رو سے پوجا پاٹ بگڑتی یا پرستش کے ذریعے قائم ہو سکتا ہے۔ دین انسانوں کی اجتماعی نظام زندگی کا نام ہے جس میں خدا کی کتاب کی حکومت اختیار کی جائے۔ جب ہم نظام زندگی یا حاکمیت انوکھو سیت کے الفاظ بولتے ہیں تو اس سے لازماً ایک نظام حکومت یا مملکت کا تصور سامنے آتا ہے۔ مملکت کے بغیر کسی کتاب کی حکومت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس حقیقت کو قرآن مجید نے یہ کہہ خود واضح کر دیا کہ دین کا ممکن اسی صورت میں ممکن ہے

مملکت کی ضرورت

جب دین کے ماننے والوں کو ملک میں ^{میں} حاصل ہو۔ سورۃ النور میں ہے۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا
اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَى لَهُمْ (٥٧)

جو لوگ اللہ پر ایمان لائیں گے اور صلاحیت بخش کام کریں گے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ انہیں زمین میں مہیا اقتدار عطا کرے گا جس طرح اقوام سابقہ کی صورت میں کیا گیا تھا تا کہ اس طرح وہ دین ممکن ہو سکے جسے اس نے ان کے لئے منتخب کیا ہے۔

اس سے واضح ہے کہ جماعت یومنین کی اپنی آزاد مملکت کے بغیر دین کا ممکن ممکن ہی نہیں، بات بالکل واضح ہے۔ دین کے ممکن کے معنی ہیں کتاب اللہ کی حکومت قائم ہونا اور حکومت لا عمالہ اپنی آزاد مملکت ہی میں قائم ہو سکتی ہے! — آج کی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ آئین پاکستان اسی صورت میں کارفرما ہو سکتا ہے جب مملکت پاکستان موجود ہو۔

ہذا، مستدرجہ بالا آیت سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جس مملکت میں دین کا ممکن مقصود ہو، وہ ظلم اور استبداد، دھاندلی اور سلب و نہیب سے حاصل نہیں کی جاتی۔ وہ خدا کی حاکمیت پر ایمان اور اس کے مطابق صلاحیت بخش پر مگر کم کی رو سے حاصل ہوتی ہے۔ بہر حال ہم کہہ رہے تھے کہ دین کا ممکن — یعنی کتاب اللہ کی حکومت — اپنی آزاد مملکت ہی میں ممکن ہے، سورہ الحج میں ہے :-

الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَآمَنُوا بِمَا نُزِّلَ
وَهُوَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَرَبُّهُ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ — (٢١)

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ اقامتِ مملوۃ اور اتیانے زکوٰۃ کا قرضہ ادا کر گئے جن امور کو کتاب اللہ نے جائز قرار دیا ہے انہیں حکمتاً نافذ کریں گے۔ جنہیں اس نے ناجائز ٹھہرایا ہے ان پر پابندی عائد کریں گے۔ مختصراً یہ کہ ان کا ہر معاملہ انجام کار خدا کے قوانین کے مطابق طے پائے گا۔

اس مقام پر ایک بڑا اہم اور غور طلب نکتہ سامنے آتا ہے۔ ہمارے مفسرین نے قرآن مجید کی سورتوں کو بھی اور مدنی حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ہم ان کے معیار تقسیم کے متعلق تو مروت کوئی بات نہیں کرنا چاہتے لیکن اس اہم حقیقت

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا | کو سامنے لانا چاہتے ہیں کہ مکی آیات کی سورتوں میں کہیں ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا“ (اے جماعتِ مومنین) نہیں آیا۔۔۔۔۔ ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ“ (اے لوگو!) ہی آیا ہے۔
”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا“ مدنی آیات ہی میں آیا ہے۔ مکی زندگی میں اکثر حضرات اسلام لے آئے تھے۔ لیکن چونکہ ان کی زندگی ہنوز انفرادی تھی اس لئے انہیں ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا“ کہہ کر مخاطب نہیں کیا گیا۔ مدنی زندگی میں جب انہیں اقتدار حاصل ہو گیا اور انہوں نے اپنی مملکت قائم کر لی تو اُس وقت ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا“ کے مخاطب

کے اہل قرار ہوتے۔ اس سے واضح ہے کہ ادبِ ایمان کیا یہاں اللہ کی حکمت ہے۔ یہی کفر اور ایمان میں عدا امتیاز دقت ہوتے ہیں جب انہیں اقتدار حاصل ہو جائے اور وہ کتاب اللہ کی حکومت قائم کر سکیں۔ اسی کو اسلامی نظام کہا جاتا ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، خدا پر ایمان کا عملی مفہوم کتاب اللہ کی حاکمیت ہے۔ یہی کفر اور ایمان میں عدا امتیاز ہے۔ جیسا کہ اس نے کہا ہے: وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ جو کتاب اللہ کی حاکمیت قائم نہیں کرتے انہیں کافر کہا جاتا ہے۔

سب سے پہلے اس قسم کی مصلحت نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ میں مدینے میں قائم ہوتی اور اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے حضورؐ سے ارشاد فرمایا کہ:

فَأَحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ - (۱۱)

اے رسول! تم ان لوگوں کے معاملات کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کیا کرو۔

اور وحی خداوندی نے حضورؐ کی زبان مبارک سے یہ اعلان کر دیا کہ:

أَفْخِرَ اللَّهُ أَجْبَغِي حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا - (۱۲)

اے لوگو! (جو انسانوں کی حکومت کے خوگر ہو چکے ہو) کیا تم چاہتے ہو کہ میں بھی خدا کو چھوڑ کر انسانی حکم تلاش

کروں حالانکہ اس نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب نازل کر دی ہے جو اپنی ہر بات کو نکھار کر بیان کر

دیتی ہے۔

آپؐ نے عہد فرمایا کہ وہ جو آیت میں کہا گیا تھا کسی نبی کو بھی اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں پر اپنی حاکمیت قائم کرے، نبی اکرمؐ کی زبان مبارک سے اس طرح واضح الفاظ میں اس کا اعلان کر دیا۔ بلکہ یہاں تک کہ ہلا دیا کہ:

قُلْ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ - (۱۳)

اے رسول! ان سے کہہ دو کہ اگر میں بھی خدا کے کسی حکم کی نافرمانی کروں تو اس کے عذابِ الیم

سے ڈرتا ہوں۔

غور فرمائیے کہ حضور نبی اکرمؐ کو مثال کے طور پر پیش کر کے انسانوں پر انسانی حکومت کے تصور کی کس طرح جھلکاٹ کر رکھی۔ یہاں تک یہ واضح ہو گیا کہ نظامِ خداوندی میں جسے الدین کہا جاتا ہے، حکومت صرف کتاب اللہ کی ہو سکتی ہے۔

لیکن کتاب اللہ کی صورت یہ ہے کہ اس میں متعین احکام محدود سے ہیں اور زندگی کے باقی معاملات کے متعلق صرف اصول اور اقدار دیتے گئے ہیں جنہیں حدود اللہ کہہ کر پکارا گیا ہے اور جامعیتِ مومنین کا فرضیہ ان حدود کا تحفظ قرار دیا گیا ہے۔

وَالْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللَّهِ - (۱۴) - ان اصول و اقدار کو حد و دیکھنے میں ایک عظیم حقیقت پوشیدہ ہے۔ جس کتاب کو تمام زمانوں اور تمام اقوامِ عالم کے لئے ضابطہ حیات اور آئینِ زندگی قرار پانا تھا اسے ہونا ہی ایسا چاہیے تھا کہ اس میں ابدی مستقل غیر متبدل حدود متعین کر دیئے جلتے۔ اور اس کتاب کی حاکمیت قائم کرنے والوں کو اس کی آزادی ہوتی کہ وہ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے جزئی قوانین اور وقتی

حُدُودِ اللَّهِ

احکام خود متعین کریں۔ یہ جزئی قوانین حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ بدلتے رہیں گے اور خدا کی مقرر کردہ حدود اپنی جگہ محکم اور غیر متبدل رہیں گی۔ اگر اس کتاب میں جزئی قوانین بھی خود ہی متعین کر دیتے جاتے تو یہ کتاب عالمگیر انسانیت اور زمانے کے بدلنے والے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکتی۔ جزئی قوانین ابدی اور غیر متغیر ہو نہیں سکتے۔

مدد اللہ کے علاوہ قرآن مجید میں جو چند احکام آئے ہیں وہ بھی ابدی ہیں، لیکن ان کے متعلق قرآن کریم نے چمکتی محفوظ رکھی ہے کہ جن حالات میں انہیں نافذ کیا جائے گا اور جس طریق سے ان پر عمل پیرا ہو جائے گا، انہیں قرآن نے خود متعین نہیں کیا۔ اپنے حالات کی روشنی میں، طریق کار کا تعین ہر دور کی قرآنی مملکت خود کرے گی۔

۱۸) یہاں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان جزئی قوانین کا تعین کس طرح سے کیا جائے گا اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے خود ہی طے فرمادیا کہ یہ کچھ جماعت مومنین کے باہمی مشورہ سے کیا جائے گا۔ آپ غور فرمائیے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے نظام مشاورت کا تصور ہی نہیں، اس کے قیام کا حکم دینا کیسی عظیم حکمت باللہ ہے۔

نظام مشاورت

سننا آج کل عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ مغربی نظام جمہوریت کے دلدادہ اس نظام کی تائید میں قرآن کے نظام مشاورت کو بطور سند پیش کر دیتے ہیں۔ انہیں کون بتائے کہ قرآن کے نظام مشاورت اور مغرب کے جمہوری نظام میں کفر اور اسلام کا فرق ہے۔ قرآن کے نظام حکومت میں یہ مشاورت قرآن کی قائم کردہ غیر متبدل حدود کے اندر رہتے ہوئے ہی عمل میں آ سکتی ہے۔ لیکن مغربی نظام جمہوریت میں قانون سازی کے اختیارات پر کسی قسم کی حدود اور قیود عائد نہیں ہوتے۔ اس میں اکثریت کا فیصلہ حق قرار پا جاتا ہے۔ یہاں ایک بڑا بصیرت افروز نکتہ سامنے آتا ہے۔ سورہ انعام کی دو آیات پہلے درج کی جا چکی ہیں۔ یعنی آیت (۱۵۹) جس میں یہ کہا گیا کہ خدا کے سوا کوئی حاکم تسلیم نہیں کیا جاسکتا اور اس نے اپنی حاکمیت کے لئے مفصل کتاب نازل کر دی ہے۔ اس کے ساتھ آیت (۱۶۰) میں کہا گیا کہ یہ کتاب مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی۔ ازاں بعد خدا کے وسیع و عظیم نے فرمایا:-

وَإِنْ تَطْعُ أَكْثَرُ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ
وَإِنْ هُوَ إِلَّا يَخْرِصُونَ - (۱۶۱)

اگر تو اکثریت کا اتباع کرنے لگ جاتے تو وہ تجھے خدا کے راستے سے گمراہ کر دیں گی۔ جو لوگ (وحی کی قیود کو اپنے اوپر عائد نہیں کرتے) وہ حق و صداقت کی نہیں بلکہ ظن و قیاس کی پیروی کرتے ہیں۔

آپ دیکھیے کہ خدا کے وسیع و عظیم نے کس طرح چودہ سو سال پہلے موجودہ دور کے نظام جمہوریت کو باطل اور گمراہ کن قرار دے دیا۔ بلا حدود و قیود قانون سازی کا اختیار صرف خدا کو حاصل ہے۔ انسانوں کو اس قسم کے اختیارات کا حامل تسلیم کر لیتا انہیں مقام انوثیت عطا کر دینا ہے جو شرک عظیم ہے۔ قرآن حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے مشاورت کا حکم دیتا ہے۔ (۱۹) جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ پہلی قرآنی مملکت رسول اللہ نے قائم فرمائی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو حکم دیا گیا کہ:-

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (۲۰)

مملکت کے معاملات میں اپنے رفعت سے مشورہ کیا کرو۔

یہ ظاہر ہے کہ جو معاملہ باہمی مشورہ سے طے کیا جائے گا وہ احکام خداوندی کی طرح غیر متبدل نہیں ہو سکتا۔ اول تو وہی مجلس مشاورت

جس نے ایک فیصلہ کیا تھا، مزید غور و فکر کے بعد، یا حالات کی تبدیلی کے تقاضے کے تحت خود اپنے فیصلہ میں تبدیلی کر سکے گی یا بعد میں آنے والی مجلس مشاورت ایسا کرنے کی مجاز ہوگی۔ اس طرح حدودِ دائرہ تو اپنے مقام پر محکم، اصل اور غیر متبدل رہیں گی اور ان کے اندر رہتے ہوئے جو کچھ باہمی مشاورت سے طے پائے گا وہ قابلِ تغیر و تبدیل ہوگا۔ یہ نظام نبی اکرمؐ اور حضورؐ کے سچے جانشینوںؑ کے زمانے میں قائم رہا اور مشاورت سے طے پائے ہوئے امور میں تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ قرآن کے اسی نظام کا نام استخلاف فی الارض یا اسلامی مملکت ہے۔ قرآن کا منشا یہ تھا کہ امت مسلمہ میں یہ نظام اسی طرح مسلسل قائم رہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں متنبہ کر دیا تھا کہ دیکھنا کہیں اس رسول کی وفات کے بعد پھر سے اُس نظام کہیں کی طرف نہ پلٹ جاتا جس میں خدا کے بجائے انسانوں کی حکومت قائم ہوتی تھی۔ (دیکھیں)

اس کے بڑھنے سے پیشتر اس نظام یا مملکت کے بنیادی عناصر تشریحی ایک باب پھر سامنے آئے۔ یعنی :-

اسلامی مملکت کے عناصر

(۱) اُن لوگوں پر مشتمل ایک امت جن کا ایمان یہ تھا کہ حق حکومت صرف خدا کو حاصل ہے اور اس کی یہ حکومت اس کی کتاب کی روش سے قائم ہوتی ہے۔

(۲) اس کتاب میں نازل کردہ احکام و اصول و افکار جنہیں حدودِ دائرہ کہا جاتا ہے، ابدی اور غیر متبدل ہیں اور ان کی روشنی میں جزئی احکام و قوانین امت کے باہمی مشورے سے طے ہوں گے۔

(۳) جو کچھ اس طرح طے پائے گا وہ اس حکومت کی مرکزی اتھارٹی کی طرف سے نافذ ہوگا۔ ان احکام کو احکام شریعت سے تعبیر کیا جائے گا۔ اس حکومت کے سوا کسی کو نہ کسی قسم کے احکام وضع کرنے کا حق حاصل ہوگا نہ نافذ کرنے کا اختیار۔ (۴) یہ احکام تمام افراد امت پر یکساں نافذ ہوں گے اور انسانی زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہوں گے۔

ان تصریحات یہ بات واضح ہے کہ قرآن کی روش سے اس امت میں نہ الگ الگ فرقے ہونگے نہ ان فرقوں کے ایک دوسرے سے الگ قوانین، نہ ہی ان قوانین میں پرسنل لازماً شخصی قوانین اور پبلک لازماً ملکی قوانین کی تقسیم ہوگی۔ مذاہب مختلفین کا وجود ہوگا نہ ان کی مرتب کردہ الگ الگ فقہیں، ایک امت ایک ضابطہ ہدایت، ایک مملکت اور اس کی طرف سے نافذ کردہ ایک ضابطہ قوانین۔ یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ ہمارے صدرِ اول کی کوئی مستند اور مصدقہ بلکہ قابلِ اعتماد تاریخ ہمارے پاس نہیں، اُس دور کی سب سے پہلی جامع تاریخ تیسری صدی ہجری میں مرتب ہوئی جسے طبرستان کے ایک مؤرخ (امام طبرانی) نے کسی تحریری مواد کے بغیر زبانی روایات سے جمع اور تدوین کیا۔ بنا بریں تاریخی طور پر تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ نظام مملکت کتنے عرصے تک قائم رہا لیکن ایک بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے۔ اور وہ یہ کہ حضور نبی اکرمؐ اور آپؐ کے رفقاء کرامؓ (جنہیں صحابہؓ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) کے دور حکومت تک یہ نظام قائم تھا کیونکہ اس امر کی شہادت قرآن میں موجود ہے کہ وہ مومن حق تھے اور مومن حق انہی کو کہا جاتا ہے جو کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم کریں۔ اس کے بعد بنو امیہ کے زمانے میں بھی دو باتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے عہد میں امت میں کوئی فرقہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ اور دوسری بات یہ کہ اُس زمانے میں قرآن مجید کے سوا قانون (فقہ) کی کوئی کتاب نظر نہیں آتی۔ اس سے منترشح ہوتا ہے کہ اس زمانے تک امت، امت واحدہ تھی۔ نہ اس میں غم جوہی فرقے وجود میں آئے تھے نہ ان کی الگ فقہیں مرتب ہوئی تھیں۔ یہ کچھ ان کے بعد عباسیوں کے زمانے میں ظہور میں آیا۔ (دراصل رہے کہ جو کچھ ہم نے بنی امیہ کے زمانے

کے متعلق لکھا ہے وہ ہمارا تاریخی اندازہ ہے جس کی صحت پر ہم اصرار نہیں کر سکتے۔ نہ ہی اسے چائے پیش نظر موضوع سے خاص تعلق ہے۔ ہم کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ قرآنی نظام مملکت کو عرصے تک قائم رہا اور اس کے بعد اس میں تبدیلی آگئی۔

(۱۰)

(۱۰) پہلے کہا جا چکا ہے کہ دین کا لیکن قرآنی نظام مملکت کے ساتھ مشروط اور وابستہ ہے۔ یہ نظام نہ ہے تو معاشرہ میں دین کا وجود ہی نہیں رہتا۔ جب قرآنی نظام حکومت کی جگہ ملکیت آگئی (رواج رہے کہ ہر وہ حکومت جو امت کے مشورے کے بجائے قوت کے بل بوتے پر چلتی ہو اسے ملکیت کہلائی گئی۔ اور جب موروثی طور پر چلتی ہو تو ملکیت کی بدترین شکل ہوگی جب مسلمانوں میں اس قسم کی حکومت قائم ہوگئی تو دین باقی نہ رہا اور اگر گناہ نہ ہو تو اس کے بعد تاریخ کے اہل پورے دور میں (یعنی اس زمانے سے لیکر آج تک) مسلمانوں کی حکومتیں تو قائم ہوتی رہیں لیکن اسلامی حکومت کہیں بھی قائم نہ ہوئی۔ ملکیت نے سب سے پہلے تعویث کی طرح ڈالی یعنی امور مملکت (جنہیں موجودہ دور کی اصطلاح میں پبلک کہا جاتا ہے) حکومت نے اپنے ہاتھ میں رکھے اور شخصی قوانین ارباب مذہب کی تحویل میں دے دیئے۔ مسلمان بادشاہ، امور مملکت کے متعلق جو فیصلے کرتے انہیں وہ اسلام کا نام سے دیا۔

موروثی بادشاہتیں

کرتے تاکہ عوام مطمئن رہیں کہ اسلامی حکومت قائم ہے۔ اس تاثر کو ہمارے علماء کرام کی تائید اور دینی تقویت پہنچاتی تھی۔ وہ ان موروثی بادشاہوں کے حق میں بحراب و منبر سے ایسا اللہ بنصرہ اور خلد اللہ علیہ حاکمہ کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ انہیں ظل اللہ علی الارض، زمین پر خدا کا سایہ، کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ ملکیت کے اس ماحول میں امور مملکت کے متعلق جس قسم کے فتاویٰ صادر ہو کر کرتے تھے اس کا اندازہ اس ایک فتویٰ سے لگا لیجئے جو فقہ حنفی کی مستند کتاب (ہدایہ اولین مجیدی، ص ۹۲) میں ان الفاظ میں درج ہے۔

کل شیء صنعه الامام الذی لیس فوقہ امام فلاحہ علیہ الاقصا۔

یعنی جن جرائم کی سزا حد ہے سزا براہ مملکت سے ان میں سے کسی کا مواخذہ نہیں کیا جاسکتا۔ بجز قصاص کے۔ یعنی سزا براہ مملکت پر قصاص کے سوا کسی جرم پر حد نہیں لگ سکتی۔ جہاں تک شخصی قوانین کا تعلق ہے چونکہ ان کی تدوین و تنفیذ کے لئے کوئی مرکزی اتھارٹی نہیں تھی، اس لئے مختلف فقہائے اپنے اپنے طور پر قوانین مرتب کر لیتے۔ اور ان کے معتقدین نے ان قوانین کا اتباع اپنے اوپر لازم قرار دے لیا۔ اس طرح یہ امت واحدہ فرقوں میں بٹ گئی۔ ان ائمہ فقہاء کی تعداد تو بہت زیادہ تھی لیکن ان میں سے چار نے بڑی شہرت حاصل کی۔ یعنی :-

- | | | |
|--------------------------------|-------------|-----------|
| (۱) امام اعظم (کوفی) | پیدائش ۱۵۰ھ | وفات ۲۴۱ھ |
| (۲) امام مالک (میں، مدنی) | پیدائش ۱۷۹ھ | وفات ۲۶۱ھ |
| (۳) امام شافعی (عسقلانی، مکی) | پیدائش ۱۸۰ھ | وفات ۲۵۵ھ |
| (۴) امام احمد بن حنبل (بغدادی) | پیدائش ۱۹۹ھ | وفات ۲۴۱ھ |

(اہل تشیع کی فقہ جعفری ان سے الگ ہے)

موضوع شروع میں تو ان ائمہ فقہاء کے متبعین اپنے اجتہاد سے ایسے مسائل بھی وضع کرتے تھے جو ان کے پیشروؤں کے خلاف ہوں۔ نیز ان کے مرتب کردہ مسائل کی فہرست میں حکم و احکام بھی کرتے رہتے تھے لیکن رفتہ رفتہ یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور عقیدہ یہ پیدا ہو گیا کہ کسی شخص کے لئے جائز نہیں کہ کسی مسئلہ میں ایسی بات کہے جو اس قول کے خلاف ہو جس کا

نہی اس کے امام نے دیا ہے۔ چنانچہ فقہار حنفیہ کے پیشوا اور مسلم امام ابو الحسن عبید اللہ انکڑی نے یہاں لکھا کہ دیکھ :
ہر وہ آیت جو اس طریقہ کے مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں وہ یا تو متول ہے یا منسوخ۔ اور اسی طرح
جو حدیث اس قسم کی ہو وہ متول یا منسوخ ہے۔

اجتہاد کا دروازہ بند کر دینے کے بعد اُس وقت تک کے دیتے گئے فتاویٰ کو کتابی شکل میں مرتب کر دیا گیا۔ ان مجموعوں
کا نام فقہ حنفی ہے۔ واضح رہے کہ یہ فقہ امام ابو حنیفہ کی مرتب کردہ نہیں۔ یہ خلفی مسلک کے مختلف فقہاء کے فتاویٰ
کا مجموعہ ہے۔ انہی فتاویٰ کا ایک جامع مجموعہ شہنشاہ عالمگیری کے زمانے میں مرتب کیا گیا جو فتاویٰ عالمگیری کے نام
سے مشہور ہے۔

مذہب کی حیثیت سے (یعنی دینی حیثیت سے نہیں بلکہ مذہبی حیثیت سے) ان فقہی احکام کی ایک اہمیت
ضروری اور وہ یہ کہ کم از کم ایک فقہ کے مقلد ایک مسلک سے منسلک رہتے تھے۔ لیکن اسے دینی حیثیت تو کسی صورت
میں بھی نہیں دی جاسکتی۔ دین کا ممکن تو اسی دن ختم ہو گیا تھا جب قرآنی نظام مملکت باقی نہ رہا تھا۔
دینی نقطہ نگاہ سے اس میں ایک اور بنیادی خرابی تھی اور وہ یہ کہ انسانوں کے وضع کردہ ان قوانین کو درجہ الوہیت
دے دیا گیا۔ یہ نکتہ غور سے سمجھنے کے قابل ہے۔ قوانین خداوندی کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ابدی اور غیر متبدل
ہیں۔ یہ حیثیت انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو دے دی جاسے تو یہ انہیں خدائی حیثیت دے دینے کے مرادف ہوگا۔
قرآن کریم نے سابقہ اہل کتاب کے خلاف جو یہ اعتراض کیا ہے کہ اتَّخَذُوا أَحْبَابَهُمْ وَرُحَبَاءَهُمْ أَرْبَابًا
مِن دُونِ اللَّهِ۔ (۲۱) کہ وہ اپنے مذہبی پیشواؤں کو خدائی درجہ دے دیتے تھے تو اس سے یہ مراد ہے کہ وہ
ان کے وضع کردہ قوانین کو خدائی قوانین جیسا درجہ دے دیتے تھے اور یہ کہلا ہوا شرک تھا۔ قرآن کریم نے امت میں
فرقوں کے وجود کو شرک قرار دیا ہے تو اس کی بھی یہی وجہ ہے (۲۲)۔ فرقے کا وجود اس عقیدہ پر قائم ہوتا ہے کہ اسکے
متبعین اپنے فرقے کے بانیوں کے وضع کردہ عقائد و احکام کو منفرد، ابدی اور غیر متبدل سمجھتے ہیں۔ کوئی دس سال اور کئی
بات ہے کہ ہمارے ہاں یہ خیال ابھر کہ مروجہ اسلامی احکام کے متعلق کچھ تحقیقاتی کام کیا جائے۔ اس تجویز کی مخالفت کرتے
ہوئے جامعہ اشرفیہ (لاہور) کے مفتی جمیل احمد تھانوی نے ارشاد فرمایا کہ :

یہ طے شدہ بات ہے کہ تحقیق و تفتیش کا کام پہلی صدی، دوسری صدی اور تیسری صدی میں پایہ تکمیل تک
پہنچ چکا ہے۔ اسی کا نام فقہ اسلامی ہے جو ائمہ ہدٰی کی تحقیقات کا مجموعہ ہے۔ لہذا اگر تحقیقات
اسلامی سے ایسے ایسے مضامین مراد ہوں جو مکمل اور نفع شدہ موجود ہیں تو موجودہ دور کی تحقیق اگر اس کے
مطابق ہے تو بلا ضرورت ہے اور اگر وہ تحقیق اس کے خلاف ہے تو مردود ہے۔ اس پر امت محمدیہ کا

لے تاریخ الشریعہ الاسلامی، مؤلف علامہ محمد انصاری کا اردو ترجمہ۔ "تاریخ فقہ اسلامی"

شائع کردہ : دار المصنفین۔ اعظم گڑھ۔ ص ۳۲

۱۔ ائمہ فقہ کی تقنینی قابلیت مسلم۔ ان کا فتویٰ اور یا امت بھی شک و شبہ سے بالا نہیں لیکن اس کے باوجود وہ کئے انسان ہی۔ انہیں مقام
انسانیت سے بلند تصور کر کے الوہیت کے درجہ پر سرفراز کر دینا شرک ہے۔

اجماع ہے۔ (بحوالہ: ایشیا۔ ستمبر اگست ۱۹۷۸ء)
یہ ہے فقہی قوانین کے متعلق وہ عقیدہ جو مسلسل چلا آ رہا ہے۔

(۱)

(۱۱) یہ صہبت صدیوں سے مسلسل چلی آرہی تھی کہ فطرت کی کرم گسٹری سے ہمارے ہاں ایک ایسا رویہ ور پیدا ہوا جو اقبال کے نام سے معروف ہے۔ اس کی نگہ بصیرت نے جب "عالم اسلام" (یعنی مسلمانوں کے ممالک) پر غور کیا تو اس نے دیکھا ان میں کسی جگہ بھی نہ اسلامی حکومت قائم ہے نہ اسلام اپنی صحیح شکل میں کارفرما۔ یہاں خلافت کی جگہ ملکیت نے لے رکھی ہے اور دین کی جگہ مذہب نے۔ اس نے اس کے خلاف جہاد کا عزم کیا اور ساری عمر اس پر قائم رہا۔ اس نے دیکھا کہ ان تمام خرابیوں کی جڑ یہ ہے کہ خلافت کی جگہ ملکیت نے لے رکھی ہے۔ (خلافت سے مراد ہے قرآنی نظام حکومت جو صدر اول میں قائم ہوا تھا) چنانچہ اس نے سب سے پہلے اس کے خلاف نعرہ بلند کیا اور کہا کہ :

خلافت بر مقام مانگو ای است حرام است آنچہ بر ما پادشاہی است
ملوکیت بہر مکر است و نیزنگ خلافت حفظ ناموس الہی است

(ارمغان حجاز، ص ۱۲۶)

انکے صفحے پر لکھتے ہیں :-

ہنوز اندر جہاں آدم غلام است نظامش خام و کارش نظام است
غلام فقیر آئی گیتی پسنا ہم کہ درویش ملکیت حرام است
یہ بہت بڑا انقلابی نعرہ تھا اور عرب و عجم کے خلاف اعلان جنگ۔ اسے اس کا پورا پورا احساس تھا کہ اس اعلان کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اسی بنا پر اس نے کہا تھا کہ :

دراختد بال ملکیت مصلی فقیرے بے کلا ہے، بے تکیا ہے
گہے با شد کہ باز یہاں کے تقدیر جنگید و کار صر از نیسے

(ص ۱۲۷)

اسے معلوم تھا کہ اس انقلابی نعرہ کی مخالفت میں مذہبی پیشوائیت سب سے پہلے میدان کارزار میں سامنے آئے گی۔ اقبال کے کلام میں ملامت کے خلاف جو کچھ کہا گیا ہے وہ کسی خاص شخصیت یا گروہ کے خلاف نہیں۔ وہ مذہبی پیشوائیت کے مسلک اور وجود کے خلاف ہے جو صدیوں سے مسلمانوں کے غیر اسلامی نظام کو اسلامی کہہ کر پیش کر رہا تھا۔ ملکیت اور مذہبی پیشوائیت کی مخالفت، اس جنگ کا منفی پہلو تھا۔ اس کے مثبت پہلو کے سلسلہ میں اقبال نے جانتا تھا کہ اسلامی نظام کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آ سکتا جب تک اسے عملی شکل میں سامنے نہ لایا جائے۔ اور ایسا کیا جاتا کہ ایسی آزاد مملکت ہی میں ممکن ہے جس میں پہلے سے کوئی نظام قائم نہ ہو۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے مملکت پاکستان کا تصور دیا۔ انہیں معلوم تھا کہ اس مملکت میں پہلا سوال یہ سامنے آئے گا کہ اس میں اسلامی قوانین کس اصول کے مطابق مدون کئے جائیں۔ اس سوال کے ضمن میں انہوں نے بڑی تفصیل سے گفتگو کی اور علاوہ دیگر مقامات، انہوں نے اپنے مشہور خطبات میں ایک پورا خطبہ اسی موضوع کے لئے وقف کر دیا ہم اس خطبہ کے چیدہ چیدہ اقتباسات پیش تاریخیں کرتے ہیں۔

خطبہ اقبال کے اقتباسات

”اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیات کھلی کی روحانی اساس، اذلی اور ابدی ہے۔ لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکر وں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر (جیسے متغنا و عناصر) میں تطابق و توازن پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر کا دور دورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ حکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرہ میں تغیر کا امکان ہی نہیں — وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیاتِ اخلاقیہ میں شمار کیا ہے — تو اس سے زندگی جو اپنی ذات میں متحرک واقع ہوئی ہے، یکسر جامد و متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی علوم میں جو ناکامی ہوئی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصول حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس، گزشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقتدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ لہذا دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اسلام کی وضع اور ترکیب میں کون سا اصول حرکت کا فرما رہا ہے؟ یہ وہی اصول ہے جسے اجتہاد کہتے ہیں“

اس کے بعد وہ اس خطبہ میں مسئلہ اجتہاد پر بڑی تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں۔ وہ اجتہادِ مطلق کو اسلام کا بنیادی اصول قرار دیتے ہیں۔ یعنی قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے قانون سازی کا کھلی اختیار۔ وہ اس اجتہاد کے متعلق بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

”وہی حضرات، نظری طور پر تو اس کے قائل ہیں کہ اس قسم کا اجتہاد ممکن ہے لیکن آخر فقہ کے مذاہب کے قیام کے بعد مثلاً اس کا دروازہ بند ہے۔ اس لئے کہ اس قسم کے اجتہاد کے لئے جن شرائط کو ضروری قرار دیا جاتا ہے، ان کا پورا کرنا کسی ایک فرد کے لئے قریب قریب ناممکن ہے۔ ایک ایسے نظامِ شریعت میں، جس کی بنیاد قرآن پر ہو جو زندگی کے متعلق حرکیاتی اور ارتقائی تصور کا علمبردار ہے، اس قسم کی ذہنیت کو عجیب سی دکھائی دیتی ہے۔ لہذا آگے بڑھنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان اسباب و علل کا انکشاف کریں جن کی وجہ سے یہ ذہنیت پیدا ہوئی جس نے فتاویٰ شریعت کو یکسر منجمد بنا کر رکھ دیا“

ہم اس وقت ان اسباب و علل کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے جنہیں علامہ اقبالؒ نے اس جمود و تعطل کا ذمہ دار گردانا ہے۔ ان میں سے دو ایک اہم نکات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ وہ (اپنے اسی خطبہ میں) کہتے ہیں :-

”آئیے اب ایک نظر ان اصولوں پر ڈالیں جو قرآن نے قانون سازی کے سلسلہ میں دیے ہیں۔ ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان اصولوں کی رُو سے یہ قطعاً نہیں ہوتا کہ انسانی فکر سلب ہو جائے اور قانون سازی کے لئے کوئی میدان ہی نہ رہے۔ اس کے برعکس، ان اصولوں میں جس قدر وسعت رکھی گئی ہے اس سے انسانی فکر بیدار ہوتی ہے۔ یہی وہ اصول تھے جن کی راہنمائی سے ہمارے قدیم فقہانے قانونِ شرعی کے متعدد نظام (سسٹم) مرتب کئے۔ اور تاریخ اسلام کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ سیاسی اور معاشرتی نظامِ زندگی کی حیثیت سے اسلام کو جو اقص

کامیابی حاصل ہوتی تو اس کام از کم آدھا حصہ انہی فقہاء کی بالغ نظری کا رہن منت تھا چنانچہ ان کے تیسرے اس ضمن میں کہتا ہے کہ:

رومیوں کو چھوڑ کر دنیا میں سوائے عربوں کے اور کوئی قوم ایسی نہیں جس کے پاس اس قدر احتیاط سے مرتب کردہ قانونی نظام ہو۔

لیکن اس تمام ہمہ گیری کے باوجود یہ قانونی ضوابط بالآخر انفرادی تعبیرات کا مجموعہ ہیں۔ اس لئے انہیں حتیٰ اور قطعی سمجھ لینا غلط ہے۔ مجھے اس کا علم ہے کہ علماء کے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے مشہور مذاہب (اربعة) اپنی اپنی جگہ مکمل اور ختم ہیں لیکن نظری طور پر اجتہاد و مطلق کے امکان سے انہیں بھی کبھی انکار نہیں ہوا۔ میں نے (پچھلے صفحات میں) ان اسباب و علل سے بحث کی ہے جو علماء کی اس ذہنیت کا موجب بنے۔ لیکن چونکہ اب حالات بدل چکے ہیں اور دنیا کے اسلام ان تمام نئی نئی قوتوں سے دوچار اور متاثر ہے جو زندگی کے مختلف گوشوں میں ٹھکانے لگی نشو و ارتقاء سے وجود میں آگئی ہیں، اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس قدامت پرستانہ ذہنیت کو باقی رکھا جائے۔ نیز یہ جتنا ہوں کہ کیا ان مذاہب فقہ کے بانیوں میں سے کسی نے کبھی اپنی تعبیرات و تاویلات کو کبھی قطعی اکمل، ختم اور سہو و غلط سے بڑی سمجھا، کبھی نہیں! اس لئے اگر دورِ حاضر کے اعتدال پسند مسلمان، زمانے کے بدلے ہوئے حالات اور اپنے تجربہ کی روشنی میں، فقہ کے اصول، اساسی کی نئی تعبیرات کرنا چاہتے ہیں تو ان کا یہ طرزِ عمل میرے خیال میں بالکل سہا اور درست ہے۔ خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عمل ارتقاء ہے، اس کی مقتضی ہے کہ ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے راہ نمائی لے سکتے ہیں لیکن اسلات کے فیصلے ان کے راستے میں روک نہیں سکتے۔“

وہ اس قسم کی ماضی پرستی کو تاریخ کا جھوٹا احترام قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ کہتے ہیں کہ،
”قوموں کے زوال کا علاج ان کے ماضی کی تاریخ کے جھوٹے احترام اور اس کے مصنوعی احیاء سے نہیں ہو سکتا، جیسا کہ دورِ حاضر کے ایک مصنف نے لکھا ہے کہ:

”تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ خیالات اور نظریات جو اپنی توانائی کو کمر فرسودہ ہو چکے ہوں، ان لوگوں میں کبھی پھر سے توانائی حاصل نہیں کر سکتے جنہوں نے انہیں فرسودہ بنا دیا ہو۔“

تیسری صدی اور اس کے بعد کے علماء کا یہ رجحان کہ ماضی کی جھوٹی تقدیس سے جماعتی نظم کو جامد اور مستحکم طور پر قائم رکھا جائے، اسلام کی روح کے بکسر خلاف تھا۔
اور اس نکتہ کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

”اسلام میں اجتہاد کا دروازہ بند کر دینا، اسلام کے خلاف افریزی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوتی کہ مسلمانوں میں قانون کے تصور نے ایک خاص معین شکل اختیار کر لی اور ایک وجہ یہ کہ قوموں کے زوال کے زمانہ میں ذہنوں میں اس قدر جمود اور تساہل پیدا ہو جاتا ہے کہ بڑے بڑے مفکرین کو (انسان سمجھنے کے سہولت، معبود بنادیا جاتا ہے۔ اگر علماء کے متاخرین میں سے بھی بعض نے اس ”افترار کو برقرار رکھا ہے تو وہ ان کا اپنا فعل ہے۔ دورِ حاضر کا مسلمان اس کا پابند نہیں کہ جس طرح انہوں نے برصا و رغبت اپنی فکری آزادی کو (اپنے خود ساختہ معبودوں کی) نذر کر دیا تھا۔ یہ بھی اپنی آزادی کو سلب ہو جانے دیں۔“

علامہ سرخسی (دسویں صدی میں) لکھتے ہیں :-

اگر اس افتراء کے حامی یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے زمانے کے مفکرین و مصنفین کو زیادہ سہولتیں حاصل تھیں، اور ان کے مقابلہ میں متاخرین کے راستے میں بہت سی دشواریاں ہیں، تو ایسا سمجھنا سراسر حماقت ہے۔ اس لئے کہ اس معمولی سی بات کے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کی عقل کی ضرورت نہیں کہ متقدمین کے مقابلہ میں متاخرین کے لئے اجتہاد زیادہ آسان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب قرآن اور سنت کی اس قدر تفسیریں اور شرحیں لکھی جا چکی ہیں کہ ہمارے زمانے کے مجتہد کے پاس تعبیرات کے لئے کافی سے زیادہ مسالہ موجود ہے (جو متقدمین کے پاس نہیں تھا)۔

ارباب علم سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ یہ نظریہ کہ کسی ایک دور کے قوانین ہمیشہ کے لئے غیر متبدل ہوتے ہیں، سب سے پہلے امام شافعیؒ نے پیش کیا تھا اور یہ سن کر آپ کو شاید حیرت ہو کہ اس کی مخالفت فقہ شافعیؒ نے کرنے کی حق۔ علامہ اقبالؒ نے ان کی اس بحث پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا :-

”امام شافعیؒ نے اپنے آپ کو صرف ان نظائر کے دائرہ میں محدود کر لیا جو عہد رسالت مآبؐ اور عہد صحابہؓ میں وقوع میں آئے تھے۔ اس سے ان کی نگاہ کا دائرہ بہت تنگ ہو کر رہ گیا۔ انہوں نے بات تو یہاں سے شروع کی تھی کہ اہمیت ٹھوس واقعات کو حاصل ہے۔ لیکن انہوں نے (ایک خاص دور کے) ٹھوس واقعات کو ابدی اور غیر متبدل سمجھ لیا، اور خاص واقعات سے متعلق احکام کو اس قسم کے ملتے جلتے واقعات پر منطبق کرنے کے لئے قیاس سے شاذ و نادر کام لیا۔ ان کے برعکس، ان کی سخت تنقیدیں مذہب حنفی کے لئے (ایک اور رنگ میں) بڑی مفید ثابت ہوئیں۔ اس سے انہوں نے محسوس کر لیا کہ اصولی قانون سازی کی تعبیر میں، زندگی کی حقیقی (واقعاتی) نقل و حرکت اور تنوع کو نظر انداز نہیں کر دینا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا مکتب فقہ جس نے ان مباحث کے نتائج کو اچھی طرح جذب کر لیا تھا، اپنے خاص الخاص اصول فقہ میں بالکل آزاد ہے اور دیگر مذاہب فقہ اور تشریع کے مقابلہ میں، حالات سے مطابقت کی بڑی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔“

اور اس کے بعد وہ کہتے ہیں :-

”لیکن جائے حیرت ہے کہ موجودہ حنفی علماء نے، خود اپنے مکتب فقہ کی روح کے خلاف، امام ابوحنیفہؒ اور ان کے فقہاء کے فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے رکھا ہے، بعینہ اسی طرح جن طرح امام ابوحنیفہؒ پر تنقید کرنے والوں نے ان فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے لیا تھا جو عہد رسالت مآبؐ اور صحابہؓ میں پیش آمدہ معاملات کے سلسلہ میں نافذ ہوئے تھے۔“

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، علامہ اقبالؒ کو اس کا احساس تھا کہ مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ان کے اس نظریے کی شدت سے مخالفت ہوگی چنانچہ انہوں نے لکھا :-

”مجھے اس میں ذرا سا بھی شبہ نہیں کہ اگر اسلامی قانون سے متعلق ضخیم لٹریچر کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو اس سے دور حاضر کے ناقدین کے اس سطحی خیال کی تردید ہو جائے گی کہ اسلامی قانون جامد اور ناقابل ترقی ہے۔ یہ قسمتی سے ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ بھی اس کے لئے تیار نہیں کہ قانون سازی کے مسئلہ کے متعلق تنقیدی نقطہ نگاہ سے گفتگو کی جائے۔ اگر کسی نے اس بات کو اٹھایا تو یہ اقدام بہت سے لوگوں کے لئے وجہ ناراضگی ہو جائے گا اور مخالفت کا دروازہ کھول

دے گا۔ بائیں ہاتھ میں کچھ عرصے کی جرات کروں گا۔

اس سے بھی بہت پہلے انہوں نے (صوفی غلام مصطفیٰ تبسم مرحوم) کے نام) اپنے ایک خط میں لکھا تھا :-
 ” ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادت انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد
 اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیات سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔ نیز جو قواعد عبادت یا
 معاملات کے متعلق (بالخصوص موخر الذکر کے متعلق) دیگر اقوام میں اس وقت تک مروج ہیں، ان پر قرآنی نقطہ نگاہ سے
 تنقید کی جائے اور دکھایا جائے کہ وہ بالکل ناقص ہیں اور ان پر عمل کرنے سے نوع انسانی کبھی سیادت سے بہرہ اندوز نہیں ہو
 سکتی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطہ نگاہ سے زمانہ حال کے ”جورس پر ووش“ یعنی اصول فقہ پر ایک
 تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی
 شخص ہوگا۔ قریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں، یا قوانین اسلامیہ پر غور و فکر کر رہے
 ہیں (سوائے ایران و افغانستان کے) مگر ان ممالک میں بھی امروز و فردا یہ سوال پیدا ہونے والا ہے مگر انہوں نے کہ
 زمانہ حال کے اسلامی فقہاء یا تورمانہ کے میلان طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ایران میں
 مجتہدین شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت پرستی نے بہارِ اللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکام قرآنی کا ہی منکر ہے۔ ہندوستان
 میں عام حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔ اس لئے ایک بڑے عالم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ حضرت
 امام ابوحنیفہؒ کا نظیر ناممکن ہے۔ غرضیکہ یہ وقت عملی کام کا ہے کیونکہ میری ناقص رائے میں مذہب اسلام گویا زمانے کی
 کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔“

علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ ”جائے حیرت ہے کہ موجودہ حنفی علماء نے خود اپنے مکتب فقہ کی روح کے خلاف امام ابوحنیفہؒ
 اور ان کے رفقاء کے فیصلوں کو ابھی اور غیر متبدل قرار دے رکھا ہے۔“ تاہم تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ امام اعظمؒ اپنے
 فتاویٰ کو کبھی ابدی اور غیر متبدل قرار نہیں دیتے تھے۔ خطیبِ بنداوی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے :-

نضر بن محمد کہتے ہیں کہ ہم امام ابوحنیفہؒ کے پاس آیا کرتے تھے اور ہمارے ساتھ ایک شام کا آدمی بھی ہوتا تھا۔
 جب وہ شامی (فرغت کے بعد) وطن کو واپس جانے لگا تو امام ابوحنیفہؒ سے رخصت ہونے کے لئے آیا۔ امام
 ابوحنیفہؒ نے اس سے پوچھا۔ ”اے شامی! کیا تم اس کلام (فقہ) کو بھی اپنے ساتھ شام کی طرف لے جاؤ گے؟“
 شامی نے جواب دیا۔ ”ہاں“ اس پر امامؒ نے فرمایا۔ ”خیال رکھنا۔ تم بڑے مشرک اپنے ساتھ لے جا رہے ہو“ خطیب
 ج ۱۳ ص ۱۷۷۔ ہذا رحم بن زفر کہتے ہیں کہ میں نے خود امام ابوحنیفہؒ سے سوال کیا کہ جو کچھ آپ فتویٰ دیتے ہیں یا اپنی
 کتابوں میں درج فرماتے ہیں کیا یہ سب حق ہے جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں؟ امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا بخدا
 مجھے معلوم نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ باطل ہو اور اس کے باطل ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو۔ امام زفر فرماتے
 ہیں کہ ہم امام ابوحنیفہؒ کے پاس آیا جایا کرتے تھے۔ جو کچھ امام ابوحنیفہؒ فیصلے فرماتے، ہم ان کو لکھ لیا کرتے تھے
 امام زفرؒ کہتے ہیں کہ ایک دن امام ابوحنیفہؒ نے ابویوسفؒ سے فرمایا۔ یعقوب! تیرا اس ہو، جو کچھ تو مجھ سے
 سنتا ہے اسے سب کا سب نہ لکھ لیا کر۔ کج میری کچھ رائے ہوتی ہے اور کل میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔ ابونعیمؒ
 کہتے ہیں کہ میں نے امام ابوحنیفہؒ کو ابویوسفؒ سے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ مجھ سے کوئی مسئلہ نقل نہ کرو کیونکہ بخدا

مجھے خبر نہیں کہ میں اپنے اجتہاد میں خطا کار ہوں یا مصیب (ایضاً) سہیل بن مزاحم کہتے ہیں کہ میں اکثر امام ابوحنیفہؒ کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنتا تھا فاضل بشر عبادی الذین یستمعون القول فیستبعون احسنہ۔ یعنی اسے پیغمبر میرے ان بندوں کو بشارت دید جو باتوں کو سنتے ہیں اور پھر ان میں جو اچھی بات ہوتی ہے اس کی پیروی کرنے لگتے ہیں۔ (ایضاً ج ۱۳ ص ۳۵۵) حسن بن زیاد لونوی کہتے ہیں کہ ہمارا یہ قول (فقد) ایک سلسلے ہے جو بہتر سے بہتر قائم کر سکتے ہیں جو ہمارے قول سے بہتر راستے لاسکے تو وہی صحت سے زیادہ قریب ہوگی۔ (ایضاً)

ہم نے شروع میں لکھا ہے کہ خود رسول اللہ کے زمانے میں جزئی قوانین باہمی مشاورت سے طے پایا کرتے تھے اور جو معاملات مشورے سے طے پائیں وہ ناقابل تغیر و تبدل قرار پائیں سکتے۔ اس ضمن میں بغدادی نے لکھا ہے کہ:

محمود بن موسیٰ کہتے ہیں کہ میں نے یوسف بن اسباط سے سنا کہ امام اعظمؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر رسول اللہؐ مجھے پاتے اور میں آپ کو پاتا تو بہت سی باتوں میں یقیناً آپ میرے قول کو اختیار فرما لیتے۔ اور ابو اسحق کو یہاں پر کہتے ہوئے سنا ہے کہ ابوحنیفہؒ کے سامنے اکثر نبی کی حدیثیں آتیں اور وہ ان سے اختلاف کرتے۔ (بغدادی جلد ۱۳ ص ۲۵۵)

آپ کے اسی مسلک کی تشریح کرتے ہوئے بغدادی نے لکھا ہے :-

ابو حواری نے بیان کیا کہ میں ایک روز ابوحنیفہؒ کے پاس بیٹھا تھا کہ سلطان کی طرف سے ایک ایلچی آیا۔ اس نے کہا کہ امیر نے پوچھا ہے کہ ایک آدمی نے شہد کا ہتھ چرا لیا ہے۔ اس کے بارے میں کیا حکم ہے۔ ابوحنیفہؒ نے بلا کسی ہچکچاہٹ کے جواب دیا کہ اس کی قیمت اگر دس درہم ہو تو اس کا ہاتھ کاٹ دو۔ ایلچی چلا گیا تو میں نے ابوحنیفہؒ سے کہا کہ تم خدا سے نہیں ڈرتے۔ رسول اللہؐ کا ارشاد ہے کہ پھل پھلوری کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا۔ تمنا اس آدمی کی مدد کو پیچھے وردہ امیر کے ہاں اس شخص کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ ابوحنیفہؒ نے بلا کسی ہچکچاہٹ کے کہا کہ وہ حکم گزر چکا اور ختم ہو چکا ہے۔ (ایضاً ص ۲۵۵)

امام اعظمؒ کے قول کا آخری ٹکڑا قابل غور ہے۔ آپ نے یہ نہیں کہا کہ مجھے اس میں شک ہے کہ وہ ارشاد رسول اللہؐ کا ہے یا نہیں۔ آپ نے کہا یہ کہ اگر وہ رسول اللہؐ کا ارشاد تھا تو بھی وہ فیصلہ اس زمانے کے حالات کے مطابق تھا اب حالات بدل چکے ہیں اس لئے اب فیصلہ موجودہ حالات کے مطابق ہونا چاہیئے۔

(۱)

اصول قانون سازی کے سلسلے میں جو کچھ علامہ اقبالؒ نے کہا ہے اس کا تلفظ یہ ہے کہ ابدی اور غیر متبدل قرآن مجید کے احکام، اصول اور اقدار میں جنہیں وہ حدود و امتداد کہہ کر بچا رہا ہے۔ ہر اسلامی مملکت اس کی عائد ہوتی ہے کہ وہ ان حدود کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق جزئی قوانین اور طریق کار خود متعین کرے۔ ایسا کرنے میں وہ سابقہ ادوار کے قوانین سے بطور نظر استفاہ کر سکتی ہے لیکن وہ ان کی پابندی پر مجبور نہیں ہوتی۔ اس باب میں وہ شاہ دلی اللہ محدث دہلوی کا ایک قول نقل کرتے ہیں جو بڑا بصیرت افروز ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو قائم کرتا ہے اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور نمونہ

استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوع انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں، لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کی عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریق کار کی رو سے رسولی کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں۔ اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی، انہیں آنے والی نسلوں پر سن و عمر نافذ نہیں کیا جاسکتا۔

(خطبات - تشکیل جدید - چٹا خطبہ)

اگر تشکیل پاکستان کے بعد علامہ اقبالؒ زندہ رہتے تو وہ اسی اصول کے مطابق قوانین مرتب فرماتے اور اس طرح صوبہ اعلیٰ کے بعد ایک بار پھر مسلمانوں کی ایک مملکت کو صحیح معنوں میں اسلامی بنادیتے۔ لیکن ہماری بد قسمتی کہ وہ اس سے بہت پہلے دنیا سے تشریف لے گئے اور اسلامی قوانین کے جس نظریہ اور مسلک کے خلاف انہوں نے اس قدر جہاد کیا تھا وہ یہاں غالب آگیا۔ اور اس خطہ زمین کو اسلامی مملکت بنانے کا جو حسین خواب اقبالؒ نے دیکھا تھا، وہ خواب پریشاں بن کر رہ گیا۔

(۱)

لیکن اس خواب پریشاں کو اب بھی عملی حقیقت بنایا جاسکتا ہے۔ اگر ملک میں ایسے ارباب دانش و بینش ہیں جو اسے عملی حقیقت بنانے کے آرزو مند ہیں، تو وہ ان گذارشات سے راہ نمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ دیکھا جا چکا ہے۔ اسلامی حکومت کی عمارت دو ستونوں پر استوار ہوتی ہے۔

(۱) مملکت کا تمام کاروبار قرآن کریم کے مطابق سرانجام پائے گا۔ اور

(۲) اس کے عملی طریق امت کے باہمی مشورہ سے طے پائیں گے۔

قرآن کریم نے مشاورت کا حکم تو دیا ہے لیکن اس کی مشینری خود وضع نہیں کی۔ اسے امت کی جوابدہی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ جب یہ مملکت پہلے پہل قائم ہوئی تھی تو اس امر کے فیصلہ کے لئے کوئی دستوری پیش نہیں آئی تھی۔ اس لئے کہ اس وقت پہلے وہ جماعت (مومنین) تیار کی گئی تھی جس کے ہاتھوں اس حکومت کا کاروبار سرانجام پانا تھا۔ وہ افراد، دل اور دماغ (سیرت اور فکر) دونوں اعتبار سے اس فریضہ کی ادائیگی کے اہل تھے۔ لیکن ہم نے جس قوم میں اس حکومت کی بنیاد رکھنی ہے، وہ تو ویسی نہیں۔ اس لئے اس میں ارباب مشاورت کے انتخاب کے لئے معیار ہمیں خود متعین کرنا ہوگا۔ اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ

(۱) ان ارکان میں، عمر حاضر کے تقاضوں کو سمجھنے کی صلاحیت ہو۔

(۲) یہ جاننے کی صلاحیت بھی کہ قرآن کریم ان تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کیا راہ نمائی دیتا ہے۔

قدامت پرستانہ قرآن نہیں سے یہ بات حاصل نہیں ہو سکے گی۔ ایسے حضرات کو اس میں شریک نہ کیا جائے۔

(۳) یہ فیصلہ کرنے کی استعداد کہ ان دونوں کی روشنی میں، مملکت کا آئین اور ملک کے قوانین کس قسم کے وضع کئے جائیں۔ (قانون سازی کے سلسلہ میں سابقہ صفحات میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے)۔ اور

(۴) ان کے اضنی کے منعلق کم از کم اتنی بڑاں کر لی جائے کہ وہ ایسا ہو جس سے لوگوں کے دل میں ان کے خلاف نفرت پیدا ہو اور ان پر اعتماد نہ کیا جاسکے۔

(۵) حکومت انہیں معاش کی طرف سے بے فکر کر دے تاکہ وہ اپنا پورا وقت مملکتی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے وقف کر سکیں۔

اس مجلس مشاورت کی شکل (عصر حاضر کی سیاست کی رو سے) پارلیمانی ہو یا صدارتی۔ وہ ایک مکانی ہو یا دو مکانی۔ اس کی مدت حیات کس قدر محدود وغیرہ وغیرہ۔ ان امور کے متعلق قرآن خاموش ہے۔ اس لئے انہیں ہم خود طے کر سکتے ہیں۔

یہ مجلس اپنے میں سے بہترین فرد کو سربراہ مملکت کی حیثیت سے منتخب کر لے۔ اس کی شرائط بھی خود طے کی جاسکتی ہیں۔ ان میں بنیادی شرط یہ ہوگی کہ وہ کسی وقت بھی مشاورت سے بے نیاز نہ ہو کر خود مختار نہ ہو سکے۔

چونکہ مجلس مقننہ ہو یا سربراہ مملکت، ان میں سے کوئی بھی قرآنی حدود سے تجاوز نہ نہیں کر سکے گا، نہ ہی کوئی ایسا قانون وضع اور نافذ ہو سکے گا جو ان حدود سے ٹکرائے، اس لئے اس ادارہ یا سربراہ مملکت سے متعلق شرائط اور حدود کو چند اہمیت حاصل نہیں ہوگی۔ موجودہ (سیکیولر) سیاست میں ان کی اہمیت اس لئے ہوتی ہے کہ انہیں بلا حدود و قیود قانون سازی کے کلی اختیارات حاصل ہوتے ہیں اور وہ اپنے سے اوپر کسی اتھارٹی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتے۔ غور سے دیکھئے تو اسلامی مملکت کی پارلیمان، اعیان حکومت یا سربراہ مملکت کو کوئی اختیار حاصل ہی نہیں ہوتا۔ وہ صرف قرآنی احکام کے نافذ کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

ان تصریحات سے یہ واضح ہے کہ اسلامی مملکت میں اس امر کا فیصلہ کرنا ضروری ہوگا کہ مملکت کا کوئی اقدام قرآنی حدود (اس کے احکام۔ قوانین۔ اصول۔ اقدار) کے خلاف تو نہیں جہاں۔ اسلامی مملکت کی عمارت میں یہی بنیادی اینٹ ہے۔ صدر اقل کی مملکت میں تو اس باب میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ وہاں تو ایک بڑھیا تک بھی جانتی تھی کہ معاملہ زیر نظر میں قرآن کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسے اس کی جرات بھی حاصل تھی (اور سربراہ مملکت کو اسے سننے کی ہمت بھی) کہ وہ قرآنی حدود سے تجاوز کر جائے والی تجویز کو بر ملا ٹوک سکے۔ لیکن ہمارے موجودہ حالات تو ایسے نہیں۔ ان میں ضروری ہے کہ سپریم کورٹ کی قسم کا کوئی ایسا ادارہ ہو جو سرزیر بحث یا زیر عمل آنے والے معاملہ کے متعلق کہہ سکے کہ وہ قرآن کے خلاف تو نہیں۔ اور اس کے فیصلہ کو فوقیت حاصل ہو۔ کہا جائے گا کہ یہ تو مخفیاً کرلیسی ہی کی ایک شکل ہو جائے گی۔ لیکن ایسا سمجھنا صحیح نہیں۔ مخفیاً کرلیسی میں تو یہی پیشوائیت، انساؤن کے وضع کردہ قوانین کو غیر متبدل اسلامی احکام قرار دے کر انہیں نافذ کرتی (یا کراتی) ہے۔ جس ادارہ کی تجویز ہم نے پیش کی ہے وہ نہ تو مذہبی پیشوائیت پر مشتمل ہوگا۔ اور نہ ہی وہ خارج از قرآن کسی فیصلہ کو خدائی فیصلہ قرار دے گا۔ وہ ان ارباب علم و بصیرت پر مشتمل ہوگا جن کی، قرآنی احکام و حقائق زمانہ پر گہری نظر ہو۔ وہ اپنی رائے کو قرآنی اسناد اور علمی دلائل کی روش سے پیش کریں گے۔ صدر اقل کی مملکت میں اس قسم کا ادارہ تو کوئی نہیں تھا، کیونکہ اس کی ضرورت ہی نہ تھی۔ لیکن امور مملکت کے فیصلے اسی اصول کے

مطابق ہوتے تھے۔ اس ضمن میں عہدِ فاروقی میں عراق کی زمینوں کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ امیر المومنین کی رائے تھی کہ ان زمینوں کو مملکت کی تحویل میں رکھا جائے۔ بعض صحابہؓ کو اس سے اختلاف تھا۔ اس مسئلہ پر مجلس مشاورت میں جو تقاریر ہوئی ہیں ان سے ہوتا ہے کہ اختلافی معاملات میں اظہارِ خیالات کی کس قدر آزادی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اپنی تجویز کو پیش کرتے ہوئے فرمایا تھا:

میں نے آپ حضرات کو اس لئے دعوت دی ہے کہ جس بایمانت کو آپ نے میرے سر پر رکھا اس کی ادائیگی میں آپ میری اعانت فرمائیں۔ اس وقت مجلس میں میری حیثیت خلیفہ کی نہیں، بلکہ آپ میں سے ایک فرد کی سی ہے۔ اس لئے آپ میں سے ہر شخص کو اپنی رائے آزادی سے پیش کرنے کا حق حاصل ہے۔ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ آپ حضرات میری مرضی کا اتباع کریں اور جسے آپ حق سمجھتے ہیں اسے میری خاطر چھوڑ دیں۔ میں آپ کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جسے میں حق سمجھتا ہوں۔ لیکن حق کا معیار نہ آپ کی رائے ہے نہ میری۔ حق کا معیار خدا کی کتاب ہے۔ اور یہ کتاب جس طرح میرے پاس موجود ہے، اسی طرح آپ کے پاس بھی ہے۔ یہی تاطیق بالحق ہے۔ آپ اسے سامنے لکھ کر جواب دیں کہ اس باب میں اس کا فیصلہ کیا ہے۔ اس پر عمل کرنا ہم سب کا فرض ہوگا۔

(شاہکلمہ رسالت - صفحہ ۳۸۵)

اس کے بعد قرآن مجید پر غور و فکر کے لئے بحث کو ملتوی کر دیا گیا۔ جب دوبارہ اجلاس شروع ہوا، تو آپ نے کہا کہ اللہ الحمد کہ قرآن پر گہری سوچ کے بعد مجھے وہ آیت مل گئی ہے جو اس باب میں قول فیصل ہے۔ آپ نے اسے پیش کیا تو سب نے اسے تسلیم کر لیا۔ اور اس کے مطابق فیصلہ ہوا (کہ یہ زمینیں مملکت کی تحویل میں رہیں گی)۔

یہ تقادہ طریق جس کے مطابق اسلامی مملکت میں اختلافی امور کے فیصلے ہوتے تھے۔ اس میں قول فیصل خدا کی کتاب، ہوتی تھی، نہ کہ کسی کی رائے۔ حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ کسی معاملہ میں رائے دی تو کسی نے کہا کہ ”یہ اللہ اور عمرؓ کی رائے ہے“ آپ نے اسے فوراً اذنا اور فرمایا کہ تو نے یہ بہت بڑی بات کہہ دی ہے۔ یہ صرف عمرؓ کی رائے ہے۔ اگر درست ہے تو اللہ کی طرف سے ہے۔ اور غلط ہے تو عمرؓ کی طرف سے ہے۔ اس کے بعد مختصری دیر خاموش رہے۔ پھر فرمایا کہ ”یاد رکھو! رائے غلط بھی ہو سکتی ہے۔ اسے اُمت کے لئے سنت مت بناؤ“ (شاہکلمہ رسالت - صفحہ ۲۷۵)

یہ تقادہ طریق جس کے مطابق اس دور میں معاملات کے فیصلے ہوتے تھے۔ ہم نے جو ایک ادارہ کی تجویز پیش کی ہے تو اس لئے نہیں کہ اس کی رائے کو قول فیصل قرار دے دیا جائے۔ بلکہ اس لئے کہ وہ قرآن کا فیصلہ سامنے لاسکے۔ جب افراد اُمت کو ایسی قرآنی بصیرت حاصل ہو جائے جیسی صدرِ اول کے افراد اُمت کو حاصل تھی تو پھر اس قسم کے الگ اداروں کی ضرورت نہیں رہے گی۔

یہ ہیں اسلامی نظام حکومت کے بنیادی خط و خال، قرآن کی روشنی میں۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کی حکومت کی داغ بیل ڈالنے کے لئے بھی بڑی جرأت اور ہمت کی ضرورت ہوگی۔ جس مملکت میں نہ مذہبی حقوق کا وجود باقی رہے، نہ ان کی فضا کا۔ جس میں پرسنل لاز اور پبلک لاز کی کوئی تفریق و تخصیص نہ ہو، اور قوانین مملکت کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہو۔ جس میں نہ کسی کے پاس دولت کے انبار جمع ہوں، نہ لامحدود اراضی کے رقبات۔ مختصر الفاظ میں، جس مملکت میں نہ کوئی فرعون ہو، نہ ہامان، نہ قارون، اس کی بنیاد رکھنے کے لئے کس قدر جرأت ایانی کی ضرورت ہوگی، یہ ظاہر ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ مملکت تدریج اپنے منہبہ تک پہنچے گی لیکن اس منہبہ (منزل) تک لے جانے والے راستہ میں بھی پیچیدگیوں کی گنگشت نہیں ہوگی۔ کائناتوں کی آبد پائی ہوگی۔ اسی لئے علامہ اقبالؒ نے اس مملکت کا تصور پیش کرنے کے بعد کہا تھا کہ اس کی ابتداء وہی کر سکے گا جو عرشہ کی سی جرات کے ساتھ کر سکے گا۔

”حسینا کتاب اللہ“

لیکن اگر کسی میں اس کی ہمت نہ ہو، تو ہم بعد ادب گزارش کریں گے کہ وہ جس قسم کی جی چاہے حکومت قائم کرے لیکن اسے اسلامی حکومت نہ کہا جائے۔ اسے مسلمانوں کی حکومت کہا جائے۔ مسلمانوں کی حکومتوں کو اسلامی حکومتیں کہہ کر ہم اسلام کو کافی نقصان پہنچا چکے ہیں۔ اس سلسلہ کو کہیں تو ختم ہونا چاہیے!

اگر علامہ اقبالؒ یا قائد اعظمؒ زندہ ہوتے تو وہ اس قسم کی حکومت کی داغ بیل ڈال سکتے تھے۔ اقبالؒ کے نظریات تو آپ کے سامنے آچکے ہیں۔ قائد اعظمؒ کے ذہن میں اسلامی حکومت کا تصور کس قدر روشن اور بالائے امیزش تھا اس کا اندازہ ان کے ان الفاظ سے لگ سکتا ہے جو انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی (حیدر آباد۔ دکن) کے طلباء کے اس سوال کے جواب میں ارشاد فرمائے تھے۔ اسلامی حکومت کی خصوصیت کیا ہوگی؟ آپ نے فرمایا تھا:-

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ اس میں اطاعت اور وفاق کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصل نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود و متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

وہ بار بار اعلان کر چکے تھے کہ ”پاکستان میں کسی صورت میں مضیا کر لیں نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزرگم خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔ اس کے ساتھ ہی ان کے حسن کردار کی بناء پر قوم کو ان پر ایسا اعتماد تھا کہ ان کے پیش کردہ آئین مملکت کی کوئی بھی مخالفت نہ کرتا۔ لیکن وہ اگر نہیں رہے تو کوئی بات نہیں۔ وہ کوئی مامور من اللہ نہیں تھے بلکہ انسان ہی تھے۔ اور اس قسم کے انسان پھر بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔“